© rasailojaraid.com

مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں جو مارچ ۴۰ء میں ہوا تھا ملک کی تقسیم کا مطالبہ کیا تھا۔ اس سال اپریل میں مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں نونہالانِ احرار نے اپنی ایک کانفرنس کی جس کی صدارت کا شرف اور اعزاز مجھے مل گیا۔ نونہالانِ احرار کانفرنس کی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ مارچ ۴۰ء میں لاہور میں قرارداد پاکستان پاس ہونے کے بعد لاہور میں یہ پہلی کانفرنس تھی جس میں صرف نوجوان تھے۔ اس میں ملک کی تقسیم کی مخالفت کی گئی تھی۔ میرا خطبہ صدارت چھپ کر اخبارات میں شائع ہوا تصویریں شائع ہوئیں اور میں قبل از وقت ایک کل ہند لیڈر بن گیا۔ قومی تحریک سے ملحقہ اور اس کا مسلمہ لیڈر، عربی مدرسوں کے اکثر علماء اور طلباء تقسیم ملک کے خلاف تھے لیکن عربی مدارس کے مہتمم صاحبان جو عموماً دو رُو سا تھے تقسیم ملک کے حامی تھے۔ غریب طلباء کو سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ مگر ان کے مہتمم صاحبان سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ مجھے عربی مدرسہ سے اس لئے نکال دیا گیا تھا کہ میں نے کھل کر سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ والد مرحوم مجھ سے سخت ناراض تھے۔ اب میری تعلیم کا مسئلہ میرے لئے ایک سخت مرحلہ تھا۔ میں اچھا خاصا کل ہند لیڈر تھا۔ لیکن میری تعلیم ناقص تھی علماء کرام سے بڑا قرب حاصل تھا۔ بعض حضرات کا مشورہ تھا کہ میں دیوبند جا کر تعلیم کی تکمیل کروں۔ بعض حضرات جن میں حضرت سندھی بھی تھے چاہتے تھے کہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کروں۔ لاہور کانفرنس میں حضرت سندھی میری تقریر سن چکے تھے اور مجھ سے بہت زیادہ متاثر اور مسرور تھے۔ آخر خدا خدا کر کے ۴۰ء میں میرا داخلہ جامعہ ملیہ دہلی کے ابتدائی مدرسہ میں ہو گیا۔ یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ اس سال حضرت استاذی عبید اللہ سندھی بھی جامعہ میں تشریف لے آئے۔ یوں مجھے حضرت سے کچھ پڑھنے اور کچھ پانے کا موقع ملا۔ بہت بڑا موقع اور بہت مبارک موقع حضرت سندھی ہفتہ میں چھ دن جامعہ میں درس دیتے تھے اور ایک دن یعنی جمعہ کو جامعہ نگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے دہلی جاکر جامع مسجد کے قریب ادارہ شرقیہ میں تفسیر بیان کرتے تھے۔ ادارہ شرقیہ میں حضرت سندھی کے درسوں میں مفتی عتیق الرحمٰن، مولانا حفظ الرحمٰن، مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے علماء کرام تشریف لاتے تھے۔ اس کم مدت میں بڑی حد تک مفتی صاحب سے متعدد ملاقاتیں اور بہت سی مدارائیں ہوچکی تھیں۔ مفتی صاحب کا ادارہ ندوۃ المصنفین قرول باغ میں تھا۔ ایک آدھ بار وہاں بھی مجھے حاضری کا شرف حاصل ہوچکا تھا۔ اب میں بڑی حد تک مفتی صاحب کے عقائد اور سیاسی افکار سے واقف ہوچکا تھا اور اب مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کرنے کے مواقع بھی مل چکے تھے۔ حضرت مفتی صاحب، مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی صاحب نہ صرف ایک دوسرے کے ہمدرد و ہمدم تھے ملک کے سیاسی عقائد و مذہبی مسلک میں بھی ایک دوسرے کے ہم مسلک و ہم مشرب تھے۔ استاذی حضرت عبیداللہ سندھی کے انتقال کے بعد ان کے افکار پر جب ایک مسلک کے علماء نے بے وقت اور بے جا تنقیدیں کیں تو حضرت سندھی کی تائید میں مولانا اکبرآبادی نے قلمی جہاد کیا۔ جس میں وہ تنہا نہ تھے۔ بلکہ ادارہ کے سب ہی اکابر اس مسلک کے قائل تھے۔ حضرت سندھی، حضرت شیخ الہند کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ لیکن دیوبند کے اکابر نے دارالعلوم کے دروازے حضرت سندھی کے لئے بند کردیئے تھے۔ حد یہ تھی کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی تک نے اخبارات میں یہ اعلان کردیا تھا کہ برطانوی حکومت کی اذیتیں برداشت کرتے کرتے حضرت سندھی کا ذہنی توازن متزلزل ہوگیا۔ حضرت شیخ الہند کا یہ جملہ میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے سنا تھا کہ ان کے صدہا شاگردوں میں سے مولانا شبیر احمد ان کی زبان ہیں مولانا سندھی ان کا ذہن ہیں اور مولانا حسین احمد ان کا دل ہیں۔ ذہن ضمیر اور زبان کے اس اختلاف نے ملت کے لئے ایک صدمۂ جانگداز اور سانحۂ عظیم کی شکل اختیار کرلی تھی۔ میں نے ان تینوں حضرات کو دیکھا اور سنا ہے ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی واقعی سب سے اچھے مقرر اور بہت دلچسپ بزرگ تھے حضرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مدنی اور مولانا سندھی کی تقاریر عوام کے لیے شگفتگی اور دلچسپی کے عناصر سے خالی تھیں لیکن علمار کے لئے سرتاسر مغز ہوتی تھیں لیکن مولانا عثمانی خطابت کے میدان کے شہسوار تھے۔ حضرت مفتی صاحب تحریر و تقریر دونوں میں ان اکابر سے کسی حد تک الگ واقع ہوئے تھے۔ ان میں غیر معمولی طور پر تنظیمی صلاحیت تھی۔ ان کے معاصر علمار کرام میں جس طرح کی خشک مزاجی اور خشونت طبع تھی۔ مفتی صاحب اس کے برخلاف شگفتہ مزاج اور مردم شناس عالم تھے۔ ان کی معاملہ فہمی اور موقع شناسی عام علمار سے بہت بلند تھی۔ اس کے صدہا واقعات میرے ذہن میں محفوظ ہیں

فخرالدین علی احمد کے دورِ صدارت میں راشٹرپتی بھون میں دعوت افطار کے موقع پر اکثر مشاہیر معاصر علمار کرام اور اہم عہدیدار مدعو ہوئے تھے۔ ایک بار اس دعوت کے موقع پر وہاں ان کے گھر کی خواتین اور بعض دوسری خواتین دعوت افطار کے اہتمام میں مصروف تھیں۔ حضرت مفتی صاحب اور دوسرے علمار کرام بھی موجود تھے۔ غالباً فخرالدین علی احمد صاحب نے مفتی صاحب سے تقریر کے لئے کہا۔ لیکن مفتی صاحب نے اپنے ایک معاصر سے کچھ کہنے کی فرمائش کی اور اس موقع پر حضرت واعظ نے رسم کے برعکس بجائے رمضان یا افطار پر کچھ کہنے کے پردہ کے موضوع پر کچھ ایسے شدید خیالات کا اظہار کیا جس سے سبھی سننے والوں نے بڑی تلخی محسوس کی خصوصاً خواتین نے جو اس موقع پر انتظامات کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ مفتی صاحب صورت حال کو بھانپ گئے اور موقع کی نزاکت کے خیال سے بغیر کسی فرمائش کے افطار اور رمضان کے بارے میں بڑے شگفتہ انداز سے کچھ کلمات ارشاد فرمائے اور آخر میں یہ فرماکر اپنی گفتگو ختم کی کہ رمضان اور اس کے روزوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس بارے میں علمار اور فقہا میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ روزہ فرض ہے غریب ہو کہ امیر، مرد ہو کہ عورت، مگر بعض فقہی مسائل میں اختلاف ہے جیسے پردہ کی نوعیت۔ بعض منہ ڈھانپنے کو ضروری خیال کرتے ہیں بعض نہیں۔ اس لئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے مسائل میں غیر ضروری شدت مناسب نہیں ہے۔ اس میں احتیاط لازمی ہے۔ مفتی صاحب کے ان چند جملوں نے پہلے واعظ صاحب کی ساری تلخی اور تہدید کی جگہ ماحول کو خوشگوار بنا دیا۔ گویا فضا کا تکدر ڈھل سا گیا۔ سامعین نے ایک طرح سے بڑے سکون کا سانس لیا۔ مفتی صاحب سے عرصے سے تعلق ہونے کی وجہ سے ایک طرح کی اپنائیت ہو گئی تھی اور حضرت مجھ پر اتنی عنایت کرنے لگے تھے کہ بعض مواقع پر مجھے اپنے ساتھ سفر میں بھی شریک کر لیتے تھے۔ یوں مجھے غم اور خوشی کے آداب سے واقف کراتے تھے۔ ایک بار میں ایک لمبے سفر سے دہلی پہنچا اور قیام ان ہی کے دفتر میں تھا۔ ادھر اُدھر کی بات چیت کے بعد ہی مجھ سے فرمانے لگے آپ کیا پنڈت سندر لال جی سے بھی واقف ہیں؟ میں نے کہا کیوں نہیں۔ میں نے ان کی متعدد تقریریں سنی ہیں۔ میں موصوف کا بے حد احترام کرتا ہوں وہ بڑے ترقی پسند رہنما اور بہت صاف گو انسان ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں قومی یکجہتی کا ایک زندہ اور مثالی نمونہ ہیں۔ مفتی صاحب میری گفتگو سنتے رہے۔ آخر آہ بھر کر کہا آج ان کا انتقال ہو گیا ہے۔ مجھے ان کی میت میں جانا ہے۔ آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔ چنانچہ میں پنڈت سندر لال کے آخری دیدار کے لئے ان کے ساتھ گیا۔ راستے بھر مفتی صاحب نے ان کے بارے میں بعض ایسی اہم باتیں بتائیں جو بعض خاص حضرات ہی جانتے تھے۔ مثلاً گاندھی جی ملک کی تقسیم کے بعد اپنی رہائش پاکستان میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے عین قتل و غارتگری کے عہد میں پنڈت سندر لال کو پنجاب بھیجا تاکہ وہ وہاں کی بربریت اور درندگی میں شرافت کا نمونہ پیش کریں اور اس طرح وہاں گاندھی جی کی آمد کی راہ ہموار کریں۔ جب دہلی میں ایک ہندو دہشت پسند نے گاندھی جی کو قتل کر دیا۔ تو سپھر گاندھی کا پاکستان جانے کا خواب پورا نہ ہوا۔

مفتی صاحب بہت کم گو اور کم خور تھے اور ساتھ ہی بہت کم نویس بھی۔ ان کی اکثر تقریروں میں میں نے یہ جملہ سنا کہ موضوع بہت اہم اور تفصیل طلب ہے۔ اس وقت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چند اشاروں ہی سے کام لوں گا کسی اور وقت تفصیل سے اظہار خیال کروں گا۔ میں نے کبھی کسی موضوع پر انہیں تفصیل سے گفتگو کرتے نہیں سنا اور اس کی حسرت دل ہی کی دل میں رہ گئی۔ جامعہ میں میں نے اپنے بعض استادوں سے مولوی کی تعریف سنی تھی کہ اس کا معدہ اور منہ ہر وقت مصروف رہتا ہے۔ مولوی کے معدے اور منہ کو آرام حرام ہے۔ مفتی صاحب اس معیار پر بھی پورے نہیں اترے۔ ان کی کم گوئی اور کم خوری اپنی مثال آپ تھی۔

علماء دیوبند سے ابتداء میں میری عقیدت بڑی حد تک اندھی عقیدت تھی۔ حضرت سندھی کی صحبت اور شاگردی میں یہ عقیدت عقلیت سے بدلنے لگی۔ آخر کچھ دن بعد یہ عقیدت پہوا ہو گئی۔ ابتداء میں میری عقیدت محض میرا خاندانی ورثہ تھا۔ یہ عقیدت نقلی تھی، حضرت سندھی کی صحبت سے جو عقیدت پیدا ہوئی وہ عقلی اور اصلی تھی۔ یہ واقعی میری اپنی عقیدت تھی۔ وہ میری اپنی عقل کا عطیہ تھی۔ کسی کی نقل نہیں تھی۔ میں زندگی بھر حضرت سندھی کے تربیت کے اس احسان کو فراموش نہیں کر سکتا۔ جامعہ کی عام فضا بھی محض عقیدت مندی کی فضا نہیں تھی۔ حضرت سندھی نے فضا کو عقلیت اور فکر و تامل سے خوب سے خوب تر کیا۔

مجھے بچپن ہی سے جن حضرات سے بے حد عقیدت تھی۔ ان میں حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد صاحب کی ذات گرامی تھی۔ مفتی صاحب بھی اندھی عقیدت کے قائل نہیں تھے بلکہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ لیکن ان کی ناپسندیدگی بھی ایک ہلکے رنگ کی طرح ہوتی تھی جس میں تیزی نام کو نہ تھی۔ اندھی عقیدت اور انتہا پسندی سے مفتی صاحب کا دامن کبھی داغدار نہ ہوا۔

حضرت شیخ الاسلام، مولانا حسین احمد مدنی بعض معاملات میں انتہا پسند تھے مجھے جس زمانے میں حضرت مدنی سے بے انتہا عقیدت تھی اور حضرت کے پیر دبانے میں مجھے اپنے درجات کے بلند ہونے پر ایمانِ محکم تھا ـــــ اس زمانے میں حضرت شاہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے مجھے حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے ملایا۔ شاہ جی کو ایک طرف حضرت شیخ الاسلام سے عقیدت تھی دوسری طرف حضرت مولانا الیاس سے بھی ارادت تھی۔ مجھے بھی شاہ جی نے حضرت مولانا الیاس سے ملایا جو تبلیغی جماعت کے مؤسس تھے، مگر سیاست سے یکسر بے تعلق۔ میں سیاسی افکار میں حضرت مدنی سے بہت متاثر تھا۔ دل میں یہ بات ایمان کی طرح بیٹھ گئی تھی کہ ساری بُرائیوں کی جڑ انگریزی حکومت ہے، جس دن یہ ختم ہو جائے گی ساری بُرائیاں ہوا ہو جائیں گی۔ انگریزوں کے بعد ہندوستان جنت نشان بن جائے گا۔ پیالے سے وہی چھلکتا ہے جس سے یہ بھرا ہوا ہے۔ دل کی یہی بات کسی طرح حضرت جی کی صحبت میں بھی زبان پر آگئی۔ حضرت جی کے تیور بدل گئے۔ مجھ سے پوچھا ہندوستان کی آبادی کتنی ہے۔ میں نے کہا، چالیس کروڑ۔ پھر فرمایا ہندوستان میں انگریز کتنے ہیں؟ میں نے کہا، زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار۔ حضرت جی نے فرمایا کہ چالیس کروڑ آدمی کیا چالیس ہزار کو جذب نہیں کر سکتے۔ میں یہ سُن کر خاموش ہو رہا لیکن یہ خیال مجھے پریشان کرتا رہا کہ انگریزوں سے لڑنا ہی ہمارا ڈرنا تو نہیں ہے۔ حضرت جی کا خیال تھا کہ اگر مسلمان عملاً سچے مسلمان ہوں تو انگریزوں کو نکالنے کی بجائے انہیں جذب کر سکتے ہیں۔ کسی قوم کی دشمنی اسلام کی دعوت نہیں ہے۔ اسلام دوسروں سے الگ ہونے کی جگہ اُن سے ملنے اور دوستی کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ میرٹھ کے کسی جلسے میں حضرت شیخ تشریف لائے۔ میں حضرت کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا۔ حضرت نے ازراہ شفقت مجھے کھانے میں شریک کر لیا۔ پھر حضرت کی لمبی تقریر سنی جو بہت اکتا دینے والی تھی۔ پھر حضرت آرام کرنے لگے۔ اب مجھے موقع ملا کہ میں حضرت سے دل کی بات کہوں جو دل میں پھانس بن کر چبھ رہی تھی۔ میں حضرت کے پیر دبا رہا تھا حضرت آرام فرما رہے تھے کہ دبی زبان سے حضرت جی کا یہ جملہ نکل گیا کہ "اسلام انگریزوں کو نکالنے کی تعلیم نہیں دیتا۔ میں ابھی اپنی پوری بات بھی کہہ نہ پایا تھا کہ حضرت مدنی غصہ سے بپھر گئے اور کروٹیں بدلنے لگے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اپنے پیر سکوڑ لیے۔ پھر غصّہ سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمانے لگے اس وقت انگریزوں سے لڑنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ انسان تو انسان اگر کتے اور سور بھی انگریزوں پر دوڑیں تو ان کا ساتھ میں دوں گا۔ حضرت مدنی کے اس طیش سے میں سہم گیا۔ اپنی گستاخی پر ندامت بھی تھی اور اتنی ندامت کہ معافی چاہنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ پھر حضرت لیٹ گئے تو غصّہ بھی لوٹ گیا۔ اب میں پھر ڈرتے ڈرتے پیر دبانے لگا، بات آئی گئی ہوئی۔

ملک کی آزادی کے بعد جب آزادی کا جشن منانے میں مدہوش اور مست تھا کہ اچانک دلّی کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس سخت مصیبت میں گاندھی جی کے دل میں خدا نے نیکی ڈال دی، بہت بڑی نیکی۔ انھوں نے مرن برت رکھا اور مسلمانوں کی حمایت میں جان کی بازی لگا دی۔ لیکن گاندھی جی کی نیکی کے جواب میں دہلی میں دہشت پسند ہندوؤں نے ان کو قتل کر کے اپنے دل کا ارمان پورا کر لیا۔ گاندھی کے قتل نے مجھے بیحد متاثر اور بہت متأسف کیا۔ گاندھی جی کے آخری دنوں میں میں ان کے ساتھ تھا۔ گاندھی کے ہمت دلانے پر مولانا آزاد، رفیع احمد قدوائی اور ان کا پورا خاندان اور مولانا حفظ الرحمٰن دلّی کے خوف زدہ تباہ حال مسلمانوں کی مدد کے لیے جم گئے تھے ڈٹ گئے تھے۔ جب دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا تھا تو قرولباغ میں مفتی صاحب کا ادارہ مکتبہ برہان اور جامعہ کا مکتبہ اور کتب خانہ آگ کی لپیٹوں میں تھا۔ اس تباہی کے بعد مکتبہ برہان قرول باغ سے جامع مسجد کے اردو بازار کی ایک گلی میں آ گیا۔ اس گلی میں مفتی صاحب کا قیام بھی تھا۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبا ابھی دہلی میں مسلمانوں کے زخموں پر مدد کا مرہم رکھ رہے تھے۔ جنگ آزادی میں حصّہ لینے والے علماء کا ایک طبقہ بھی اس صورت حال پر انگشت بدنداں تھا اور سخت مایوسی کا شکار تھا کہ کیا سوچا تھا اور ہو گیا کیا۔

حضرت مدنی بھی ایک سخت کشمکش سے گزر رہے تھے۔ وہ اسی زمانے میں دہلی میں آئے اور کشمیری دروازے کی ایک مسجد میں قیام تھا۔ وہاں عقیدت مندوں کی ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھیڑ تھی۔ آزادی کے بعد میری حضرت مدنی سے ابھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی میں مفتی صاحب کے ہاں بیٹھا ہوا تھا مفتی صاحب نے بڑی سنجیدگی سے مجھ سے کہا حضرت مدنی آئے ہوئے ہیں کشمیری دروازے کی ایک مسجد میں قیام ہے آپ جا کر مل لیجئے۔ میں اس سے پہلے حضرت مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید کے دلی جذبات سے واقف تھا۔ آزادی کے بعد اس قیامت کے ہنگامے میں مجھے مولانا احمد سعید کا وہ لطیفہ یاد تھا کہ جب میں نے ان سے پوچھا تھا کہ حضرت یہ کیا ہوا؟ مولانا احمد سعید بڑے شگفتہ مزاج اور زندہ دل بزرگ تھے۔ برجستہ کہا

'میاں صاحب ہوا کیا ۔ پکائی کھیر تھی قسمت سے ہوگیا دلیہ'

میرا خیال تھا کہ حضرت مدنی سے مل کر بھی یہی بات چیت ہوگی اور آزادی کے بعد ان کے تاثرات معلوم کرسکوں گا۔ حضرت مفتی صاحب کے اکسانے سے میں بھی حضرت مدنی کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ نوعمری ہی سے حضرت کا عقیدت مند اور ارادت مند تھا۔ سفر حضر میں بھی حضرت کا ساتھ رہ چکا تھا۔ دیوبند میں میں جب بھی گیا تو مدنی حضرت کے درِ دولت پر ان کے خوانِ نعمت پر کھانے میں شریک ہونے کا شرف بھی مجھے حاصل ہوا۔ مگر آج کی ملاقات کا رنگ ہی کچھ نرالا تھا۔ میں جوں ہی مسجد میں داخل ہوا تو حضرت کو میرے آنے کی اطلاع دی گئی حضرت کی خدمت میں مجھے حجرے میں بلایا گیا۔ مجھے دیکھتے ہی حضرت پر ایک ایسی سخت کیفیت طاری ہوگئی کہ میں دنگ رہ گیا۔ فرمایا کہ تمہیں تو رسول کی شکل ہی سے بے تعلقی ہے۔ جس کو رسول سے اجنبیت ہو مجھے اس سے کیا واسطہ مجھے تم سے کلام و طعام بھی گوارا نہیں۔ میں حضرت کے اس غصے سے سخت پریشان اور نہایت پشیمان تھا۔ میرا وہی حال تھا کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن حضرت کے ساتھ ان کے عقیدت مندوں کا ایک مجمع تھا۔ سب کے چہروں پر ماشاءاللہ اللہ کا نور تھا۔ لیکن دلوں پر خوف و ہراس کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے۔ یہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ زمانہ تھا جب مولانا سعید اکبر آبادی جیسے جید عالم نے بھی شش و پنج کرنا شروع کر دیا تھا حضرت مدنی کی اس ناراضگی اور خفگی نے مجھے بھونچکا کر دیا تھا۔ اس مجمع میں حضرت مولانا محمد میاں مراد آبادی بھی تھے وہ مجھ سے بخوبی واقف تھے۔ حضرت مدنی کے اس رویّے سے وہ بھی کسی قدر متاثر تھے۔ جب میں حضرت مدنی کے حجرے سے بے حد پشیمانی اور نہایت پریشانی کے عالم میں باہر نکلا تو مولانا محمد میاں مرحوم بھی میرے ساتھ ہی حجرے سے باہر آ گئے۔ مجھے دلاسا دیا۔ فرمایا حضرت سے ملے بغیر ہرگز نہ جایئے۔ میں نے تعجب سے کہا، اب ملنے کا کیا سوال؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں حضرت سے جوتے کھاؤں۔ مولانا محمد میاں مسکرائے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ حضرت کا غصہ آپ سے بربنائے محبت ہے۔ ابھی میں حضرت سے کہتا ہوں کہ آپ اصلاح کا وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ آپ سنت کی پیروی کریں گے تب آپ ان کی دعائیں لے کر جایئے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مولانا محمد میاں مرحوم نے واپس جا کر حضرت سے میری خاص طور پر سفارش کی۔ حضرت مدنی خاموش ہو گئے۔ میں نے بڑے ادب سے مصافحہ کیا۔ پھر میری خیریت معلوم کی۔ لیکن سیاست کے سانحے اور دلّی کی نئی صورت حال پر حضرت نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں جب اس افتاد کے بعد مفتی صاحب کے ہاں اپنے وعدے کے مطابق حاضر ہوا تو مجھے دیکھتے ہی مسکرائے جیسے ساری صورت حال سے بخوبی واقف ہوں۔ پھر فرمایا کہیے کیسی گزری؟ میں نے کہا حضرت سے

چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی

فرمایا نہیں۔ اس میں پشیمانی کا کیا سوال۔ میں نے اپنی ساری افتاد سنا ڈالی۔ فرمایا۔ یہ بھی ایک رنگ ہے۔ اچھا ہوا۔ آپ نے دیکھ لیا۔ پھر کچھ دیر دلجمعی اور تسلی کی باتیں کرتے رہے لیکن حضرت مدنی کے بارے میں اس سے زیادہ ایک لفظ بھی نہیں کہا

ملک کی آزادی اور تقسیم کے سانحے کے بعد جہاد آزادی کے سربراہ علماء میں سے اکثر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذہنی پریشانی اور نفسیاتی پشیمانی میں مبتلا تھے۔ ان کا یہ یقین کہ ملک کی ساری خرابیاں اور ملت کے سارے مسائل کا واحد حل ملک کی آزادی ہے۔ اب چکنا چور ہو چکا تھا۔ اپنی فکری کج روی کا برملا اعتراف بڑا مشکل مرحلہ ہوتا ہے یہی مشکل ان حضرات کے سامنے پہاڑ بن کر آکھڑی ہوئی تھی۔ لیکن دلوں کا چور کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی صورت میں ظاہر بھی ہو جاتا تھا، چند اکابر ملت البتہ ایسے ضرور تھے جو اس وقت اپنے اس مسلک پر سختی سے کاربند تھے کہ جب آگ لگ رہی ہو تو یہ سوال اٹھانا کہ آگ کس نے لگائی ہے بے وقت کی راگنی ہے پہلے لگی ہوئی آگ بجھائی جائے پھر اس پر بحث اور گفتگو ہو کہ آگ کس نے لگائی اور کیوں لگائی تھی۔ ان حضرات نے جس ہمت مردانہ اور فکر عارفانہ کا مظاہرہ کیا وہ علمائے ہند کی تاریخ میں قابل فخر باب ہے۔ دہلی میں مولانا حفظ الرحمٰن، مفتی عتیق الرحمٰن اور مولانا احمد سعید انہی علمائے کرام میں سے تھے۔ مفتی صاحب نے اس زمانے میں اپنا یہ معمول بنا لیا تھا کہ وہ روزانہ نہایت پابندی کے ساتھ دن چھپے جمعیۃ علماء کے دفتر گلی قاسم جان پہنچ جاتے اور پھر رات کو کافی دیر سے اپنے مکان واپس تشریف لاتے۔ وہ اس نفسا نفسی کے زمانے میں مولانا حفظ الرحمٰن کے خصوصی مشیر اور ہمہ وقتی معاون تھے۔ اس تعاون مسلک اور اتحاد مزاج نے دونوں کو ایک دوسرے کا سچا رفیق اور مخلص رازدار بنا دیا تھا کوئی بات کتنی ہی معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی ہی کیوں نہ ہو مفتی صاحب مولانا حفظ الرحمٰن کے مشورے کے بغیر کچھ نہ کہتے تھے اور اسی طرح مولانا حفظ الرحمٰن ہر معاملے اور ہر مسئلے میں مفتی صاحب کے ایما کے بغیر کچھ نہ کرتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن اور مفتی صاحب کی پہنچ اس زمانے میں براہِ راست مولانا آزاد اور پنڈت جواہر لال نہرو تک تھی۔ اس پہنچ کے نتیجے اور پرواز کے انجام میں دلی کے بہت سے مسلمانوں کی کروڑہا روپیوں کی جائدادیں انھیں کسٹوڈین سے واپس مل گئیں اس کار خیر اور کامیابی نے ان حضرات کے حوصلے بلند اور حلقے کو وسیع کر دیا۔ مفتی صاحب اس بڑے محیط کا ایک ایسا چھوٹا سا مرکز تھے جس پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بہت کم کسی کی نظر پڑتی تھی اور جچتی تھی۔ میں اس زمانے میں جامعہ کالج کا طالب علم تھا۔ مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے حافظ مجیب الرحمٰن عثمانی بھی جامعہ کالج کے طالب علم تھے وہ مجھ سے جونیر تھے لیکن جامعہ کی اقامتی زندگی میں جونیر اور سینیر میں چنداں فرق نہ تھا۔ اس لئے وہ میرے دوست اور بے تکلف ساتھی تھے۔ مفتی صاحب سے پہلے ہی سے ہمارے خاندانی مراسم تھے اور میں خصوصیت سے مفتی صاحب سے خوردی اور بزرگی کے تعلقات رکھتا تھا۔ اب مفتی صاحب کے صاحبزادے کی دوستی کے بہانے مفتی صاحب کی خدمت میں حاضری کے اور بھی نت نئے مواقع پیدا ہوگئے۔ مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن سے اکثر میں اپنے ذاتی معاملات اور جامعہ کے حالات پر گھنٹوں بحث اور گفتگو کیا کرتا تھا۔ جب مفتی صاحب کے صاحبزادے حافظ مجیب الرحمٰن عثمانی جامعہ کے اساتذہ میں شامل ہوگئے تو ان حضرات کی جامعہ سے دلچسپی اور واقفیت میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا۔ ذاکر صاحب کے علی گڑھ چلے جانے کے بعد جامعہ سے ان کی بے تعلقی بہت ہی غیر متوقع تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر ذاکر صاحب آزادی کے بعد جامعہ کے اس تعمیری اور تعلیمی کام میں لگے رہتے جو وہ اس سے پہلے انجام دے رہے تھے تو یہ نہ صرف جامعہ کے لئے بہت اچھا ہوتا بلکہ اس سے ذاکر صاحب کی بلندی بھی مزید بلندیوں کا ذریعہ اور زینہ بن جاتی۔ مگر افراد کی طرح اداروں کی بگڑی قسمت کو کون بنا سکتا ہے۔ جب جامعہ کے اندرونی معاملات اور انتظامی صورت حال زیادہ بگڑنے لگی تو حضرت مفتی صاحب اور مولانا حفظ الرحمٰن اکابر جامعہ سے حرف شکایت زبان پر لائے بغیر نہ رہ سکے۔ بزرگان جامعہ نے اس پر چنداں توجہ نہ کی۔ اس سے یہ حضرات کافی دل برداشتہ اور جامعہ کی طرف سے مایوس ہوگئے۔ حضرت مفتی صاحب اپنے عقائد اور افکار میں دیوبند کے اکابر ہی کی طرح غیر متزلزل تھے۔ مگر معاملات اور انتظامی مسائل میں بہت دور رس نرم اور صلح پسند تھے۔ علماء دیوبند میں مفتی صاحب کا یہ امتیاز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کا خاص اپنا مزاج تھا جس کے متعدد مظاہرے میں نے بھی دیکھے اور ان سے بہت متاثر اور بہت مسرور ہوا۔ تمام علماء کے برخلاف مفتی صاحب اپنے مخالفین سے بھی اپنائیت تواضع اور ملنساری کا سلوک روا رکھتے تھے اور اس معاملے میں ہر طرح کی جانبداری سے بلند تھے جب دارالعلوم کا جشن منانے کا بڑے پیمانے پر اہتمام ہو رہا تھا تو مفتی صاحب ان سربراہوں میں سے تھے جو انتظامی معاملات میں سب سے زیادہ دخیل تھے۔ علماء دیوبند کو جماعت اسلامی کے مسلک سے سخت اختلاف تھا اور حضرت مفتی صاحب بھی جماعت اسلامی کے مسلک سے بہت واضح اختلاف رکھتے تھے۔ لیکن جب مسز اندرا گاندھی نے ایمرجنسی کا نفاذ کیا تو جماعت اسلامی کے بہت ارکان بھی ملک کی دوسری فرقہ پرست جماعتوں کے رہنماؤں کے ساتھ تھوڑی سی مدت جیل میں رہے، اس قربت اور مدت جماعت اسلامی کے بعض اکابر پر یہ راز منکشف ہوا کہ علمائے دیوبند نے سیکولرزم کی حمایت کر کے ایک بڑا اہم اجتہاد کیا ہے اسی وقت سے جمہوریت اور سیکولرزم کے بارے میں جماعت اسلامی کے رویے میں کچھ معمولی تبدیلی آئی۔ مفتی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ملک کی آزادی کے بعد سے مدتوں تک جو بات ہم جماعت اسلامی کو نہ سمجھا سکے وہ جیل میں چند دنوں میں ہندو فرقہ پرستوں نے ان کو سمجھا دی۔ مجلس مشاورت میں مفتی صاحب کے اسی رویہ نے جماعت اسلامی کے بہت سے ارکان کو اپنا ہم نوا بنا لیا اور جماعت اسلامی کے بہت سے اکابر مسائل اور معاملات میں مفتی صاحب سے صلاح لینے اور مشورہ کرنے میں کوئی جھجک اور تکلف محسوس نہ کرتے تھے اور پوری طرح مشاورت کے قائل ہو گئے۔ دارالعلوم دیوبند کے جشن منانے کے موقع پر وہاں ایک بازار لگانے کی تجویز پاس ہوئی تھی۔ جہاں لوگ عام ضرورت کی چیزیں خرید سکیں۔ اس بازار میں جماعت اسلامی کے حضرات بھی اپنی کتابوں کی دکان لگانا چاہتے تھے۔ دیوبند کے کٹر علماء جماعت اسلامی کی کتابوں کی دکان کے خلاف تھے۔ اور یہ حضرات اپنے ہی اکابر کی کتابیں اس نمائش میں رکھنا، دکھانا اور بیچنا چاہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حضرت مفتی صاحب نے ان حضرات کو یہ بات سمجھائی کہ اگر کچھ لوگ جماعت اسلامی کی کتابیں پڑھنا چاہتے ہیں تو اچھا یہی ہے کہ وہ اس کے لئے جماعت اسلامی کی دکان سے یہ کتابیں خریدیں اور ہم اپنی دکان پر ان کی کتابوں کی ذمہ داری نہ لیں ہم اپنے اکابر کی کتابیں اپنی دکان پر رکھیں تو نہ زیادہ اچھی بات ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور معاملہ فہمی سے مدرسہ کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب کو بھی اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہاں جماعت اسلامی کی ایک دکان کھل جانے سے آپ کے مسلک اور مرتبے پر کوئی آنچ نہ آئے گی جس طرح چائے اور کھانے کی بہت سی دکانیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر کتابوں کی بھی متعدد دکانیں ہوں تو اس پر کون سی اعتراض کی بات ہے چنانچہ یہ تدبیر کارگر ہوئی اور وہاں جماعت اسلامی کی کتابوں کی فراہمی کا ایک مرکز مہیا ہو گیا۔

مفتی صاحب دارالعلوم کے لائق فرزندوں میں تھے۔ وہ ان کے خاندان کے اکابر کو اس ادارے سے جو ربط اور تعلق تھا وہ دیوبند کی تاریخ کا ایک باب ہے۔ لیکن کئی ایسے سخت مرحلے بھی آئے جب حضرت مفتی صاحب اور ان کے خاندان کے بزرگوں کو نہ صرف اس ادارے سے اختلاف کرنا پڑا بلکہ ہجرت کی سنت پر بھی عمل پیرا ہونا پڑا۔ جب حضرت مفتی صاحب کے استاد حضرت کشمیری نے دیوبند سے ڈابھیل کی راہ لی تو اس وقت بھی مفتی صاحب شمع انوری کے پروانوں میں تھے۔

ملک کی تقسیم کے بعد جب دیوبند پر ایک آزمائشی وقت پڑا۔ دارالعلوم کے مہتمم قاری محمد طیب صاحب دیوبند سے بہت دور اور دیر تک ایک نئی تعلیمی بستی بسانے کی فکر میں کچھ دنوں کے لئے چلے گئے۔ قاری صاحب کی عدم موجودگی میں دیوبند کے اہتمام کا مسئلہ اکابر علماء کے لئے ایک سخت مرحلہ بن گیا۔ بعض حضرات نے قاری صاحب کی عارضی جدائی کو مستقل قرار دے کر نئے مہتمم کے انتخاب کی ضرورت محسوس کی اور دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا حسین احمد مدنی کو بھی اس کے لئے آمادہ کر لیا۔ اس سلسلہ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دہلی سے مولانا حفظ الرحمٰن اور مولانا بشیر احمد کٹھوری، حضرت مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید صاحب ایک کار لے کر دہلی سے میرٹھ پہنچے تاکہ دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے ایک رکن حکیم محمد اسحاق کٹھوری کو اپنے ساتھ دیوبند لے چلیں اور وہاں حضرت شیخ کو اس کے لئے آمادہ کریں کہ وہ مفتی عتیق الرحمٰن کو مدرسہ کا مہتمم بنانے کی تجویز پاس کریں۔ ان میں سے بعض حضرات نے جب یہ تجویز حکیم محمد اسحاق کے سامنے رکھی تو وہ سب کچھ سن کر خاموش رہے اور ٹس سے مس نہ ہوئے لیکن حکیم صاحب کے چھوٹے صاحبزادے حکیم محمد ادریس صاحب نے جو اس وقت اس گفتگو کے موقع پر وہاں موجود تھے۔ مولانا احمد سعید کے کان میں کہا کہ آپ ابا سے کہیں کہ مہتمم محمد اسد اللہ خاں بدایونی کو بنوادیں تاکہ جو کام مفتی صاحب چار دن میں کریں وہ مولوی اسد اللہ خاں دو دن میں پورا کردیں (مولوی اسد اللہ خاں حکیم صاحب کے بچوں کے اتالیق تھے۔ کانگریس کی تحریک میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ ایک مخلص کارکن تھے لیکن انتظامی معاملات میں انھیں کوئی تجربہ اور کوئی دخل نہ تھا) مولوی احمد سعید صاحب نے یہ سُن کر قہقہہ لگایا اور دیر تک بے اختیار ہنستے رہے۔ دوسرے حضرات نے اس ہنسی پر استفسار کیا تو مولوی احمد سعید صاحب نے یہ راز کی بات سب سے کہدی کہ حکیم صاحب کے صاحبزادے میاں محمد ادریس کی تجویز مولوی اسد اللہ کو مہتمم بنانے کی ہے۔ اس پر دوسرے حضرات نے بھی خوب خوب لطف لیا اور مفتی صاحب کے اہتمام کی بات آئی گئی ہوئی جب یہ حضرات کار میں سوار ہوکر دیوبند روانہ ہونے کو تھے تو مولوی احمد سعید صاحب نے بطور مذاق حکیم اسحاق صاحب سے کہا کہ حکیم صاحب آپ پسند کریں تو مولوی اسد اللہ کو بھی ساتھ لے چلیں۔ اس پر حکیم صاحب بھی ہنس پڑے اور کار دیوبند کے لئے روانہ ہوگئی ——— دیوبند پہنچ کر حکیم اسحاق صاحب نے خلاف توقع حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے بڑے تند و تلخ لہجے میں کہا کہ قاری محمد طیب صاحب آپ ہی کی وجہ سے یہاں سے گئے ہیں۔ آپ ہی چاہتے ہیں کہ وہ یہاں نہ آئیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سارے معاملات کی ذمہ داری آپ پر ہے۔ اور آپ چاہیں تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے آپ قاری صاحب کو مدعو کریں تو وہ واپس آجائیں گے اور میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ چنانچہ وہاں یہ بات طے پائی کہ قاری صاحب کو واپس بلوانے کے لئے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی اعانت خصوصی حاصل کی جائے اور قاری صاحب کو واپس بلوا لیا جائے چنانچہ مولانا آزاد کی ذاتی دلچسپی سے یہ کوشش بارآور ہوئی اور حضرت قاری صاحب واپس اہتمام پر آ گئے۔

چمن میں پھر سے نسیم بہار آ پہنچی

تیسرا اور آخری سانحہ جس نے مفتی صاحب کو بہت بددل اور مایوس کر دیا وہ دارالعلوم کے جشن کے بعد قاری صاحب کی جانشینی کے مسئلہ کا آخری سین تھا جس نے اس ڈرامے کو ایک سخت اور عظیم المیے پر ختم کر دیا۔ ان دنوں جس طرح کے اختلافات نے سر اٹھایا اور پھر عالم اسلامی کی اس سب سے بڑی دینی اخلاقی اور روحانی اقدار کی حامل دانش گاہ نے جو برے دن دیکھے وہ اس دانش گاہ کیلئے سب سے بڑی روسیاہی اور رسوائی کا عظیم المیہ ہے۔ مجھے اس زمانے میں مفتی صاحب کی اس خوبی کا بخوبی مشاہدہ ہوا کہ وہ طوفان سے پہلے طوفان کے آثار سے طوفان کا کتنا صحیح اندازہ لگا لیتے ہیں۔ بُرائی کے واقع ہونے سے پہلے اس کی شدت کو اس کی علامتوں سے کس قدر صحیح ناپ لیتے ہیں۔ مفتی صاحب کی فہم و فراست میرے لئے ایک عجوبہ سے کم نہیں تھی۔ میرے لئے محترم اور مفتی صاحب کے ایک معتمد خاص عالم کو حکومت ہند نے ایک بڑے علمی اعزاز سے نوازا۔ میں اس تقریب میں اپنے محترم استاد ڈاکٹر عابد حسین مرحوم کے ساتھ شریک تھا۔ مفتی صاحب بھی اس خصوصی محفل میں تشریف رکھتے تھے۔ میں نے بڑی گرم جوشی اور نہایت تپاک سے مفتی صاحب کو مبارکباد دی اور مجھے یقین تھا کہ وہ میری اس مخلصانہ تہنیت سے بہت مسرور اور ممنون ہوں گے لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مفتی صاحب نے کسی گرم جوشی یا خوشنودی کے اظہار کے بجائے ایک آہ سرد بھر کر آسمان پر نگاہ ڈالتے ہوئے مجھ سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہا۔ خدا دار العلوم کو ہر بلا سے بچائے۔ اس موقع پر مفتی صاحب کا یہ تاثر میرے لئے ایک عقدۂ لاینحل تھا کہ ایک عالم دین جو دار العلوم کے فرزند تھے اور حضرت مفتی صاحب سے گہرے مراسم بھی رکھتے تھے حکومت نے ایک علمی اعزاز سے نوازا تھا۔ یہ بات تو خود دار العلوم کے لئے باعثِ فخر اور مفتی صاحب کے لئے باعثِ مسرت ہونی چاہیے تھی مگر مفتی صاحب کا یہ رویہ انھیں ایک روحانی خانوادے سے متعلق کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ تھا جو میں سمجھ سکتا۔ کچھ دن کے بعد حکومت نے اسی ادارے کے ایک اور فرزند کو ایک ایسے ہی علمی اعزاز سے نوازا اور مفتی صاحب کسی جلسے میں شرکت کے لئے بعض دوسرے علمار کے ساتھ بنگلور تشریف لائے اور مجھے اپنی ملاقات کا شرف عطا کیا۔ ایک خصوصی محفل میں میں نے پھر بڑی گرم جوشی سے اور انتہائی خلوص سے اپنا نذرانۂ تہنیت مفتی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ میں متوقع تھا کہ وہ مسرور ہوں گے اور مطمئن۔ اب پھر مفتی صاحب نے کچھ تامّل سے ٹھنڈی سانس بھری اور مجھ سے فرمانے لگے کہ لوگ علامات قیامت سے قیامت کا اندازہ نہیں لگاتے۔ قیامت کے آنے کے منتظر رہتے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک بڑا طوفان برپا ہونے والا ہے۔ خدا خیر کرے اور دیوبند کو نظر بد سے بچائے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مفتی صاحب اور بعض دوسرے علمار مسز اندرا گاندھی کے رویہ سے سخت برہم اور بیزار تھے۔ جشن دار العلوم کے موقع پر میں وہاں اپنی یونی ورسٹی کی جانب سے بطور نمائندہ تھا اور یہ محسوس کر رہا تھا کہ بظاہر یہ چھوٹا سا ادارہ عالم اسلامی میں کتنی اہمیت اور کس قدر وقعت کا حامل ہے۔ وہاں میں نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی اور دوسرے ملکی قائدین کی تشریف آوری پر قدرے تعجب کا اظہار کیا تھا۔ مسز اندرا گاندھی نے اس جشن کے موقع پر دیوبند جا کر اس عظیم اجتماع کی کیفیت کا بچشم خود معائنہ کیا تھا لیکن اپنے تاثرات کو اپنے دل میں اس طرح چھپالیا تھا کہ کسی ذہن پر اس کا کوئی عکس نہ پڑ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سکے ۔ اگر میرا قیاس غلط نہیں ہے ۔ یہی وہ نقطۂ آغاز تھا جس نے بعد کو دیوبند میں ایک بڑے طوفان کی شکل اختیار کر لی ۔ دلی سے جو ہندوستان کا دل اور اس کی راجدھانی ہے کچھ دور دیوبند کا یہ قصبہ اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے ایک بوریہ نشین کے بلاوے پر عالم اسلام کی اتنی شخصیتوں کا اتنا بڑا اجتماع بھی ممکن ہے ۔ ایک عربی مدرسہ کا بوریہ نشین اور عالم اسلام کی ایسی برگزیدہ اور ممتاز شخصیتوں کا میزبان ؟ یہ تھا مفتی صاحب کا وہ خطرہ ، وہ اشارہ وہ بھیانک خواب جس کی طرف وہ مجھے بار بار متوجہ کر رہے تھے اور میں نا آشنائے راز اس جشن کی کامیابی اس کی عظمت اور اہمیت پر خوشی کے مارے پھولا نہ سماتا تھا ۔ میں جس قدر مطمئن اور مسرور تھا اور مفتی صاحب اتنے ہی ملول اور متاسف ۔ میں وہاں سے لوٹا تو دیوبند اس کی عظمت اس کی روحانی اہمیت قاری صاحب کے حسن انتظام کے مناظر اور مظاہر ان کی مقبولیت اور عظمت کے نقوش میرے دل و دماغ پر بہاروں کی طرح رونق اور رنگینی کا سرمایہ اور سامان فراہم کر رہے تھے ۔ لیکن مفتی صاحب کی دور رس نگاہیں اس جشن کی تعمیر میں چھپی ہوئی اس تخریب پر جمی ہوئی تھیں جو کسی کے تصور میں نہ تھیں ۔ میں نے اس جشن کے موقع پر مفتی صاحب کو جس قدر متاسف اور متحیر دیکھا اتنا کبھی نہ دیکھا ۔ آخر کچھ دن کے بعد ایک دھماکہ ہوا ایک ایسا سیاسی زلزلہ آیا جس نے دیوبند کی روحانی اور اخلاقی قدروں کو آناً فاناً ملیا میٹ کر دیا ۔ یہ وہی زلزلہ تھا جس کا خطرہ اور خیال رمزاً و ایماءً مفتی صاحب نے کئی بار ظاہر کیا تھا ۔ اس زمانے میں مجھے دہلی اور دیوبند ، حیدرآباد اور بمبئی کے بہت سے عمائدین کی بہت سی انہونی باتیں اور ہوش رُبا روایتیں بہت سے معتبر اور مستند حضرات سے مجھے اس ادارے کی بلندی اور پستی کی وہ وہ باتیں اور گھاتیں دیکھنی اور سننی پڑیں جن کی علمائے دین سے نسبت بھی ان کی توہین ہے ۔ اس بارے میں خود مفتی صاحب سے بھی مجھے کئی بار تبادلہ خیال کی نوبت آئی اور میں نے محسوس کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ شاید ان کے تدبر سے اب یہ گتھی سلجھ جائے اور یہ معاملہ بگڑنے سے بچ جائے۔ ایک روایت جو درایت پر مبنی تھی یہ بھی تھی کہ حضرت مفتی صاحب نے حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب کو اہتمام سے دست بردار ہونے کے لئے آمادہ کر لیا ہے اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی کو اہتمام کی ذمہ داری سونپے جانے کی بات پکی کر لی ہے۔ مگر مسلمانوں کے دار العلوم کی قسمت میں جو روسیاہی مقدر ہو چکی تھی اسے نہ مفتی صاحب کی کوئی تدبیر روک سکی نہ علمائے کرام کا وقعت و وقار کا پہاڑ ریت کا ٹیلہ بننے سے بچ سکا۔ دین کے تقویٰ اور طہارت کے نمائندوں نے اپنے ہی بزرگوں کی رسوائی اور اپنے ہی اسلاف کی روسیاہی کا جو ثبوت اور سرمایہ فراہم کیا اس پر کون یہ کہنے سے باز رہ سکتا ہے ؎

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو

اس ادارہ ملّی کے نزاع نے حضرت مفتی صاحب کو حد درجہ ملول اور مغموم کر دیا تھا مگر حضرت قاری طیب کے انتقال پر ملال نے انہیں یک سر امید کی روشنی سے محروم کر کے ناامیدی کے اندھیرے میں مبتلا اور مفلوج کر دیا تھا۔ آخری بار ملاقات ہوئی تو اندازہ ہو گیا کہ گو مفتی صاحب بقید حیات ہیں مگر اب اس قید اور حیات دونوں کا دم واپسی ہے۔ یہ چراغ جو کبھی روشنی اور رونق رکھتا تھا اب صرف دھواں ہی دھواں رہ گیا۔ چند منٹ مفتی صاحب کی خدمت میں خاموش بیٹھ کر مجھے احساس ہوا کہ اب ان سے گفتگو کرنا یا کسی سوال کا جواب پانا اب ان کی روحانی اور ذہنی اذیت میں اضافہ کرنا ہے۔ میں خاموشی سے بغیر مصافحہ لئے اٹھا۔ ابھی مڑا بھی نہیں تھا کہ نہ معلوم کیسے اور کہاں سے مفتی صاحب کی گم شدہ قوت گویائی عود کر آئی، بے نور آنکھوں میں آخری بار روشنی کی ایک رمق بن کر چمکی جسم میں ایک جنبش خفی سی ہوئی، رک رک کر اتنا فرمایا کہ آتے رہیئے۔ پھر اپنے آپ کو نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سنبھال سکے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے تسلی کے دو چار لفظ کہے۔ مزاج پرسی کرنے والوں نے ہمت دلائی متعلقین نے دلاسا دیا اور خدمت کرنے والوں نے انہیں آہستہ آہستہ لٹانے کی سعی کی۔ رک رک کر یہ کہنے کی کوشش کرتے رہے کہ میرے بعد بھی آتے رہیئے۔ میں لوٹ آیا اور پھر ہونے والی بات ہو کر رہی۔

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com